ڈاکٹر حمیرا اشفاق
استاد شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

# فہمیدہ ریاض کی شاعری کا کثیر الجہاتی مطالعہ

**Dr. Humaira Ashfaq**
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic Universirt, Islamabad

## A Multi-Part Study of the Poetry of the Fehmida Riaz

Fehmida Riaz is such a powerful voice of her time that its echo will continue to be heard in the times to come. There are many facets of her poetry, including Roman novelism and revolutionary poetry. He does not compromise on aesthetic aspects while covering the issues. She also fights with her pen to identify the woman who has been running the shrine for centuries. She is also familiar with the world scene, history and the currents of civilization. These are the things that affect a poet's thought and thus she writes poems against her inner layers, mental confusions, and social injustices. In poetry, the attraction of emotions inherent in men and women is seen in a very unique way. This research paper seeks to explore all aspects of Fehmida Riaz's poetry so that literary critics can become acquainted with her every color, rather than looking at her art from just one aspect of feminism.

**Key Words**: *Fehmida Riaz, Poweful, Poetry, Novelism, Revolutionary.*

فہمیدہ ریاض اپنے عہد کی ایسی توانا آواز ہے جس کی بازگشت آنے والوں زمانوں میں بھی سنائی دیتی رہے گی۔ان کی شاعری کی کئی جہات ہیں جن میں رومانویت بھی ہے اور انقلابیت بھی۔ لیکن ان کا فن ان کثیر الجہاتی مو ضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے جمالیاتی پہلوؤں سے اغماض نہیں برتتا۔ وہ اپنے قلم سے عورت جو کہ صدیوں سے راندہ درگاہ ہے اس کی شناخت کا مقدمہ بھی لڑتی ہیں۔ ان کو اپنے ارد گرد پھیلی ناانصافیاں اور ظلم و بربریت سے پیدا کردہ دہشت کی فضا سے بھی الجھن ہے۔ وہ عالمی منظر نامے، تاریخ اور تہذیب کے دھاروں سے بھی آشنا ہیں۔ یہی باتیں ایک شاعرہ کی فکر پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یوں وہ اپنے باطن کی پرتوں، ذہنی الجھنوں، معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف نظمیں لکھتی ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری میں مرد اور عورت کی ذات میں مضمر جذبات کی کشاکش بڑے منفرد انداز میں نظر آتی ہے۔ خالدہ حسین، فہمیدہ ریاض کے نسائی شعور کے بارے میں لکھتی ہیں:

۔۔۔شروع ہی سے اس کے ہاں ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جو روایت کے مطابق نہ تو اپنے عورت ہونے پر شرمندہ اور ملول ہے نہ قہراً و جبراً اپنے آپ کو قبول کرنے کی قائل۔ وہ اپنی جنس کی قدر دان ہے اور پوری زندگی کے نظام اور اس کے ارتقاء میں اس کردار کا گہرا شعور رکھتی ہے۔۔۔اس کی محبت کسی خلا یا بند کمرے یا مجلس محبوب کی بزم میں نہیں، بلکہ کائنات کے وسیع تناظر میں ایک کشادہ فضا اور آفاقی مناظر میں پروان چڑھتی ہے۔ محبت اس کے لیے محض ایک تصور نہیں ایک حسیاتی تجربہ ہے۔ جس میں انسان کی پوری شخصیت شامل ہے۔[۱]

خالدہ حسین مزید لکھتی ہیں:

۔۔۔اس کی لفظیات میں حسیاتی شدت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ وہ پانچوں حواس کی شاعرہ ہے۔ رنگ، خوشبو، آواز، لمس اور ذائقہ اس کے اشعار میں دھڑکتی تپش پیدا کرتے ہیں۔[۲]

لیکن بہت جلد فہمیدہ خوابوں کے سراب سے نکل کر زندگی کی حقیقتوں کا کھلی آنکھوں سے تجزیہ کرنے لگتی ہیں۔ یوں ان کے موضوعات ذات کے دکھ سے نکل کر کائنات کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ بقول شاہ محمد مری

اس نے ایسے ایسے عنوانات باندھے جن پہ آج بھی میدانی زرعی پاکستان کا دانشور رام رام بولتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔۔۔ فہمیدہ نے کبھی بھی "اگر مگر" کو قریب آنے نہ دیا۔ اس نے کوئی ذو معنی اور مہمل بات نہ کی۔[۳]

لیکن اس قدر براہ راست زندگی کی حقیقتوں کو موضوع بنانے والے شاعر بسا اوقات حرف میں فنی خوبصورتی اور زبان کی چاشنی کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر فہمیدہ ریاض کی شاعری جہاں بلاغت کا کمال رکھتی ہے وہیں اردو، ہندی اور لوکل لہجوں اور لحن کا بھی حسن اور رچاؤ قائم رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کے ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے کلیات سب لعل و گہر کے دیباچے میں عامر حسین ان کے اسلوب کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

فہمیدہ ریاض کی تحریریں، اصناف اور لہجوں کی کثرت سے عبارت ہیں۔ آصف فرخی نے ان کے اسلوب کو "کلاسیک نفاست" کا نام دیا ہے۔[۴]

یوں تو فہمیدہ ریاض کی شاعری میں قومی اور بین الاقوامی منظر ناموں کے ساتھ ساتھ فکری اور نظریاتی کئی موضوعات موجود ہیں۔ جن کا الگ الگ بھی ذکر کیا جا سکتا ہے اور ایک تخلیق کار کی اپنی ذات سے جڑے ہوئے سماجی اور سیاسی نظام کو یکجا کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے، لیکن اپنے تئیں فہمیدہ ریاض کی شاعری کی تین بنیادی جہتوں کو سمجھنے اور سامنے لانے کی کاوش کی ہے۔ جن میں ان کی ابتدائی شاعری میں خوبصورت اور نازک جذبوں میں ڈوبی رومانویت، بدن دریدہ عورت اور تانیثیت اور تیسرا ان کا سیاسی اور عصری شعور۔ اس طرح ہم اپنے دور کی اہم اور نظریاتی جنگ لڑنے والی شاعرہ کے موضوعات کا مطالعہ کر سکیں گے۔

**فہمیدہ ریاض کی شاعری کا رومانوی پہلو:**

فہمیدہ ریاض کا پہلا شعری مجموعہ "پتھر کی زبان" اکتوبر ۱۹۶۷ء میں سامنے آیا۔ جسے کتاب نما، راولپنڈی نے شائع کیا۔ کتاب کے پیش لفظ میں فہمیدہ اپنی شاعری کے حوالے سے اپنے قاری سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتی ہیں کہ :

> میں حیران ہوں کہ آپ کو کیا بتاؤں؟ میں نہیں جانتی کہ آپ ان نظموں کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہوں گے۔ کیا آپ اس بات سے دلچسپی رکھتے ہوں گے یا جاننا چاہیں گے کہ یہ کیسے اور کیوں لکھی گئیں۔ (۵)

پھر اس دیباچے میں ایک ایک سوال کی وضاحت کرتی جاتی ہیں۔ لیکن وہ ایک بات پر بڑا واضح بیان دیتی ہیں کہ میں کیسے لکھتی ہوں؟

> میں بہت دیانت سے لکھتی ہوں اور میں سچے غرور سے کہوں گی کہ میں نے کبھی قافیہ پیمائی نہیں کی اور نہ ہی لفظوں سے ملتے جلتے لفظ استعمال کرنے کے لئے ایک بھی مصرع کہا۔ جب تک میں نے خلش اپنی ہڈیوں تک محسوس نہیں کی، میں نے قلم نہیں اٹھایا۔۔۔ (۶)

اس مجموعے کی پہلی نظم "پتھر کی زبان" عورت کے احساسات اور وفا کے میدان میں تنہا رہ جانے کی کسک کو پیش کرتی ہے۔ عورت اپنی یادوں کو دامن میں سمیٹے اسی ایک منزل پر ٹھہر جاتی ہے جہاں اسے زندگی نے ایک بار چھوڑا ہو۔ یہی یادیں اس کے وجود کو لہولہان کئے دیتی ہیں مگر صدیوں کے اذیت ناک سفر کے باوجود نوکیلے

پتھروں کو یاقوت سمجھ کر اپنے دامن کو بھر لیتی ہے لیکن ناامیدی کی بجائے امید کی ایک ننھی کونپل گلاب بن کر پتھر کے سینے سے راستہ بنا لیتی ہے۔

> ۔۔۔۔۔ یہاں عورت بغیر کسی قدغن اور احساس جرم کے محبت سے سرشار ہے اور اس کے تمام مراحل بخوشی قبول کرتی ہے۔ یہاں ہمیں نسائی شاعری کا وہ وژن نظر آتا ہے جو اسے ایک منفرد تخلیقی آہنگ عطا کرتا ہے۔ عورت کے سراپا اور اس کے ہار سنگھار کا ایسا بیان جس میں صرف جنسی تحریک نہیں جمالیات کا ایک پرانظام ہے۔(۷)

شاہ محمد مری فہمیدہ ریاض کے اولین شعری مجموعے کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> فہمیدہ نے کبھی بھی "اگر مگر" کو قریب آنے نہ دیا اس نے کوئی ذو معنی اور مہمل بات نہ کی اس کی شاعری سیدھی بات کرتی ہے (اور سیدھی بات کا مطلب بے حجاب بات کرنا بالکل نہیں ہوتا) وہ اپنے انسان ہونے پر اتراتی ہے، اپنے عورت ہونے پر تو باقاعدہ فخر کرتی ہے۔ وہ عورت کو زندگی، زندگی کا جوہر اور زندگی کا ارتقا گردانتی ہے۔(۸)

مزید لکھتے ہیں کہ:

> وہ کبھی بھی اپنے لفظ کو بے حجاب نہیں رہنے دیتی، مگر اسے برقع بھی نہیں پہناتی۔ عام نارمل انسان، انسانی مسائل، انسانی خواہشیں، انسانی محبت اور اس کی سرشاری۔۔۔۔(۹)

"پتھر کی زبان" کی نظمیں نیم رومانوی فضا لیے ہوئے ہیں۔ ایک مکمل وجود رکھنے والی عورت کے احساسات کا نغمہ ہے جسے موسم، خوشبوئیں، رنگ، رات سبھی مل کر اس کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی ایک اور نظم "اب سو جاؤ" میں نسائی اظہار کو بڑے سلیقے اور خوبصورتی سے الفاظ کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ عموماً اردو شاعری کا مزاج یہی رہا ہے کہ مرد کی طرف سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور عورت کو محض محبوبہ کی ہی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اگر ہم کلاسیکی شاعری میں عورت کا سراپا دیکھیں تو وہ ایک مورت ضرور ہے لیکن اس کی اپنی ذات کا، یا پسند ناپسند کا اظہار تقریباً ناپید ہے۔ متذکرہ بالا نظم میں عورت، ایک ایسے عاشق کے روپ

میں سامنے آتی ہے جو مرد کے حُسن کو سراہتے ہوئے، اس کے قرب کی لذت کشید کرتے ہوئے لمحوں کو تھم جانے کی خواہش کرتی ہے۔ اس نظم کے ایک بند میں تیسرے کا ذکر بھی ہے لیکن عاشق، معشوق کے درمیان وہ رقیب بننے کی بجائے کہانی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ جسے شاعرہ بڑی روانی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے سکون کے لمحوں کو امر کرنے میں محو ہو جاتی ہیں۔

سو جاؤ۔۔ تم شہزادے ہو
اور کتنے ڈھیروں پیارے ہو
اچھا تو کوئی اور بھی تھی؟
اچھا پھر بات کہاں نکلی؟
کچھ اور بھی باتیں بچپن کی
کچھ اپنے گھر کے آنگن کی
سب بتلا دو۔۔ پھر سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو۔ (۱۰)

اس اولین کتاب میں موجود ساری شاعری عشقیہ شاعری ہے بہت مترنم، متوازن، ابریشم جیسی نرم شاعری، کانچ جیسی نازک شاعری۔ محبوب کی عدم التفاتی، ہمیشہ کے لیے اس پر فراق، پیاسی روح کی شاعرہ، پتھرِ وفا کی فہمیدہ۔

اور جو کہنے سے تھی زباں لاچار
ہہ گئی چور، گرمیٔ رخسار (۱۱)

بقول خالدہ حسین:

۔۔۔پتھر کی زبان رومانوی کرب کی کیفیت سامنے لاتا ہے۔۔۔۔۔۔چونکہ وہ فطری طور پر ایک باغی عورت ہے اس لیے وہ اپنے موضوعات پر کوئی قدغن برداشت نہیں کرتی۔ وہ رسم و رہِ عام سے صرف کلیشے کے طور پر ہٹ کر نہیں چلتی بلکہ اس کو یقین ہے زندگی تصورات پر نہیں تجربات پر بسر ہو نی

چاہیے۔۔۔۔وہ زندگی کو اس کی مادی حقیقت سے عاری سمجھنے سے انکار کرتی ہے۔(۱۲)

فہمیدہ ریاض کی ایک اور نظم "وہ لڑکی" بھی نسائی جذبوں میں رچی ہوئی ہے۔اس نظم میں بھی رقابت کا ذکر بڑے مدھم انداز میں ملتا ہے۔

؎ مجھ سے کہتے تھے، بن کاجل اچھی لگتی ہیں مری آنکھیں
تم اب جس کے گھر جاتے ہو، کیسی ہوں گی اس کی آنکھیں۔(۱۳)

فہمیدہ ریاض کی ایک اور نظم "مہمان" بھی ان محبت کے گیتوں میں سے ایک ہے جو ہمیں "پتھر کی زبان" میں جابجا بکھرے نظر آتے ہیں، وہ رومان جو ایک عورت کے وجود سے جڑا ہے جس میں جسم ایک حقیقت بن کر اپنی ان کہی ادھوری خواہشوں کے بھنور میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

متذکرہ بالا نظم "مہمان" میں بھی فہمیدہ مرد اور عورت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

؎ میں تب بھی سوچا کرتی تھی
یہ ساتھ بڑا لمحاتی ہے
جذبے کی تھوڑی سی گرمی
جلتے چھالے بن جاتی ہے (۱۴)

عورت اور مرد کا تعلق دونوں کے لئے اپنی اپنی نوعیت کا حامل ہے، مرد کے لئے محض ایک لمحاتی لذت جب کہ عورت کے لئے تمام عمر کا ایک پڑاؤ جس کے راستے میں اس کی یادوں کے نوکیلے پتھر اس کے وجود کا ثبات عطا کرتے ہیں۔

عورت کے حصے میں آنے والی ہجر کی صعوبتوں کو فہمیدہ ریاض اپنی ایک نظم "اس کا دل تو اچھا تھا" میں بھی بیان کرتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ:

؎ کیوں ایسی سنسان سڑک پر اسے اکیلا چھوڑ دیا
اس کا دل تو اچھا دل تھا جس کو تم نے توڑ دیا
وہ کچھ نادم، وہ کچھ حیراں، رستہ ڈھونڈا کرتی تھی
ڈھلتی دھوپ میں اپنا بے کل سایا دیکھ کے ہنستی تھی

اکثر سورج ڈوب گیا اور راہ میں اس کو شام ہوئی (۱۵)

"پتھر کی زبان" کی اکثر نظمیں محبت جیسے آفاقی جذبے کے اظہار کے نئے قرینوں میں ڈھال کر پیش کی گئی ہیں، لیکن ان نظموں کے در پردہ ایک ہلکی سی درد کی چبھن، لاحاصلی کا کرب اور ادھ ادھوری خواہشوں کی کرچیاں لفظوں میں ڈھل کر فہمیدہ ریاض کے درد مند دل کا اظہار بن جاتی ہیں۔ اس مجموعے کی آخری نظم الفاظ کے بے معنی ہوتے ہوئے احساس کو اس طرح بیان کرتی ہے:

اک حرف مدعا
اک حرف تھا لبوں پر، کھٹکتا تھا پھانس سا
اک نام تھا زبان کا چھالا بنا ہوا
لو میں زباں تراش کے خاموش ہو گئی
لو اب تو میری آنکھ میں آنسو نہیں کوئی
بس ایک میرا انگ۔۔۔ میرا حرفِ مدعا (۱۶)

فہمیدہ ریاض کا دوسرا شعری مجموعہ "بدن دریدہ" سامنے آیا تو لوگوں نے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نظمیں محض فحش مضامین باندھنے اور چونکانے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس ضمن میں فہمیدہ ریاض اس کتاب کے دیباچے میں لکھتی ہیں کہ:

کار گاہِ ہستی میں کسی حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہو گا جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو۔۔۔ جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو میں نے اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں ایک رجز ہیں جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے "بدن دریدہ" ایک رزمیہ ہے۔ اسے پڑھ کر لوگ چونکے تو کیا بُرا ہے۔ (۱۷)

بدن دریدہ میں فہمیدہ ریاض کے موضوعات محض کچے جذبوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ زندگی کی حقیقت کے ریگستان میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہوئے اپنے وجود کے لئے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔

"پتھر کی زبان" میں ہجر اور وصال کی کشاکش میں الجھی عورت اب ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس کے لئے بہت سی خواہشیں اور خواب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے وجود کے ساتھ سامنے آتی ہے جسے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اور ذہنی رویوں کے ساتھ قبول کیا جائے۔بدن دریدہ کے اولین صفحات پر درج زخم "دل سرد ہوا" میں شاعرہ اس بے نیازی کا ذکر یوں کرتی ہیں:

دل سرد ہوا
اب شام حبس
آئے بھی تو کیا
سینے میں کہیں
وہ درد نہیں
دن بیت گئے (۱۸)

بدن دریدہ کے بارے میں شاہ محمد مری لکھتے ہیں کہ

> بھئی یہ کتاب نہیں یہ جنگی ترانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ مقہوروں، مجبوروں، اور محکوموں میں سب سے محکوم آبادی یعنی عورت کے جنگی ترانے۔ یہ صرف جذباتی انداز میں حوصلہ بڑھانے کے ترانے نہیں ہیں۔۔۔۔ یہ ایک ایسی عورت کی شاعری ہے جو اب شادی شدہ خاتون بن گئی ہے۔ جہاں Sexuality کو زبردستی کے ذریعے سماجی ضرورتوں کا دستِ نگر بنا دیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ ،ایسے موضوعات جو سماج کے اندر منکرات و ممنوعات میں تصور ہوتے تھے۔ اور جب یہ موضوعات ایک عورت کے منہ سے نکلے تو ایک قیامت آ گئی۔ (۱۹)

"عشق آوارہ مزاج" میں بھی فہمیدہ ریاض اسی موضوع کو پھر سے باندھتی ہیں کہ:

عشق آوارہ مزاج
وہ مسافر تو گیا!
نہ کوئی اس کی مہک ہے کہ جو دے اس کا پتہ
نہ کوئی نقشِ کفِ پا

نہ کوئی اس کا نشاں
یہ ہے انسان کا دل
کوئی پتھر تو نہیں!
جس پہ مٹی نہیں پڑ جائے جو اک بار لکیر (۲۰)

نظم "کندن" میں عورت کے خالی دامن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابتدائی سطور میں فہمیدہ ریاض اس کا پیکر تراشتی ہیں، اس کا سراپا بیان ہو جانے کے بعد اس میں مخفی کندل دل کا ذکر کرتی ہیں۔ لیکن آخر میں اسی عورت کی بے کسی اور تنہائی کا نوحہ لکھتی ہیں جو دوسروں کا دامن تو خوشیوں سے بھر دیتی ہے لیکن اس کے دونوں ہاتھ خالی رہ جاتے ہیں۔

نظم "برف باری کی رُت" میں پھر سے فہمیدہ ریاض "پتھر کی زبان" والی لَے میں حال میں خالی ہاتھ کھڑے اسی ایک لمحے میں معلق نظر آتی ہیں جہاں سے اس نے محبت کی گرمی برف پوش راستوں پر محسوس کی تھی۔

گئے موسموں کی اس رُت کو وہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ گنگناتی ہوا میں محسوس کرتی ہیں۔ وقت کی بے ثباتی کو بالخصوص خوبصورت لمحوں کے تحلیل ہو جانے کے دکھ کو فہمیدہ ریاض مٹھی میں سمیٹنا چاہتی ہے لیکن وہ تتلی بن کر اڑ جاتا ہے۔ تاہم وقت کے رنگ ہتھیلیوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

وقت!
گزرتا وقت، کسی کے بس میں نہیں ہے
کوئی بھی چاہت، کوئی بھی آنسو، اس کا دامن گیر نہیں ہے۔
مٹ جاتا ہے۔ لمحہ لمحہ
وقت کوئی تصویر نہیں ہے
حسرت سے میں تکتی جاؤں مَل مَل ہاتھ
منظر منظر اڑتا جائے چھوڑ کے ساتھ (۲۱)

فہمیدہ ریاض نے جذبوں کے ساتھ جڑے جسم کو بھی شاعری میں اپنی تمام تر حسیات کے پیش کیا ہے ایک ایسا جسم جو ابھی بھوک پیاس اور خواہشات رکھتا ہے۔

یہ تمام جبلتیں جو پدر سری معاشرے میں صرف مردوں کی غلام ٹھہریں ان پر عورت نے اپنا حق جتاتے ہوئے، ان گونگی خواہشات کو نطق عطا کیا۔

یہاں عورت اپنے بارے میں بڑی بہادری سے بول رہی تھی۔ اپنے تجربات کے بارے میں بات کر رہی تھی، اور اپنے حمل ٹھہرنے کو "جسم سے پھوٹتی روشنی" قرار دے رہی تھی۔۔۔ بدن، اپنے معنی اور مفاہیم بدل چکا تھا۔ (۲۲)

میں کہ بنتِ ہجر ہوں
مجھ میں ایسی آگ ہے
میں کہ میرے واسطے
میری ایسی پیاس ہے
میگھ اس میں بھیگ کر
ہانپتی کھڑی کھڑی
کہہ رہا ہے دل میرا
یہی ہے مدھر ملن کی گھڑی (۲۳)

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں صرف مختلف اتنا ہے کہ اس سے پہلے اردو شاعری نے عورت کی آواز تو سنی ہے لیکن اس کے بدن کی آواز نہیں سنی۔ جسم کی لذتوں کو کسی عورت کا روپ نہیں دیا۔

یہ تمام موضوعات ایک مرد تخلیق کار سے جنم لیتے تو شاید اتنا شور برپا نہ ہوتا بلکہ کمر ڈھونڈھنے والے شاعر، ریختی کہنے والے شاعر تو کبھی مورد الزام نہ ٹھہرائے گئے۔ بس ایک عورت نے جذبوں کو مجسم کر دیا تو جلاوطنی کی صعوبتیں تک اس کا مقدر ٹھہریں۔

اب اس کتاب میں عورت نے دوسروں سے اپنے بارے میں بیان دینے کا حق چھین لیا۔ اب عورت اپنے بارے میں خود بول رہی تھی۔ اب بدنِ زن خود بول رہا تھا، زنِ زندہ کا بدن۔۔۔۔ (۲۴)

"زبانوں کا بوسہ" بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جس کو عورت نے لکھا تو سب سے بڑا جرم ٹھہرایا گیا۔ جب کہ مثنوی اور داستانوں سے راہ پانے والا اردو ادب ایسے ایسے مبتذل موضوعات سے بھرا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

لیکن فہمیدہ ریاض کے نسائی شعور کو اس کی انفرادیت کو اور اس کے اظہار کو محض 'فحش' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں مقصد فہمیدہ ریاض کی وکالت ہر گز نہیں لیکن اس کے پس پردہ معانی، اور ادھورے جذبوں کی کسک کے سوا کچھ نہیں۔ فہمیدہ ریاض ایک ایسی باغی شاعرہ ہے جس نے اپنا اسلوب خود تراشا ہے اس کے ہاں روایتی استعارے اور خیالات نہیں بلکہ وہ معاشرے کی سوچ پر جمی گرد کو ہٹا کر حقیقی اور سچے رشتوں کی تصویریں بنانا چاہتی ہے۔

نظم "اس قدر تر و تازہ" میں بھی شاعرہ دل کی پاتال میں چھپے جذبوں کو سامنے لانے کی کوشش کرتی ہے۔

؎ پر میں اپنے بوسوں سے
کس لئے ہراساں ہوں
دل کی تھاہ میں میرے
جو اداس جذبہ ہے
اس سے کیوں ہوں شرمندہ (۲۵)

بدن دریدہ میں شامل ایک اور نظم "پہلی بار" میں بھی فہمیدہ ریاض وصل کے لمحوں کو بڑے قرینے سے پیش کرتی ہیں۔ جن میں سانس بھی گویا اونچی لینے سے زندگی کے رنگ بکھر سکتے ہیں۔

؎ پہلی بار
پیار کے بعد
اک دوجے کی بانہوں میں
اپنے دماغ اور بدن کی عریانی کے آئینہ خانے میں
اتنے نہتے!

؎ اتنے نازک
سانس جھجک کر لیتے ہیں ہم
کانچ کے پُتلے ٹوٹ نہ جائیں

فہمیدہ ریاض کی شاعری کا ایک پہلو ان کا رومانوی نسائی رویہ بھی ہے جس میں عورت اپنے پورے وجود، پورے ذہن اور زندہ امنگوں کے ساتھ متشکل ہوتی ہے جبکہ معاشرے نے عورت کو ایک "شے" یا چلیں یوں کہہ لیجئے کہ "خوبصورت شے" کی طرح عیش کدہ، حرم سراؤں اور چار دیواری میں ایک خوبصورت گڑیا بنا کر رکھا جس کی خوبصورتی سے دل ضرور بہلایا جائے لیکن اس کو قوتِ گویائی نہ ہو۔ فہمیدہ نے اس بے جان تصویر میں زندگی کی روح پھونکی، اس نے بتایا کہ "محبوبیت کے سوا اس میں ایک عاشق بھی موجود ہوتا ہے، جو مرد کی خوبصورت پیشانی، اس کے ہاتھوں کو اس کی صورت کو سراہ بھی سکتی ہے اور چاہ بھی سکتی ہے وہ محبت کے لمحوں، اپنے پورے احساسات اور اظہار کے ساتھ شامل ہے۔"

فہمیدہ ریاض کی شاعری صرف نسائی جذبوں کی ترجمان ہی نہیں ہے بلکہ اس میں خواتین کے حقوق کی آواز، اس کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بڑی واضح نظر آتی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اس معاشرتی جبر کے خلاف قلم اٹھائی جس میں عورت کو کبھی صارف کی نظر سے دیکھا گیا ہے تو کبھی اسے پدر سری معاشرے کی غیر منصفانہ تقسیم کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو فہمیدہ ریاض تاریخ کے جبر کے ساتھ جوڑ کر دیکھتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی نظم "اقلیما" میں ہابیل اور قابیل کے درمیان وجہء تنازعہ بننے والی عورت جس کے جسم کے حصول کے لئے دو بھائی دست و گریبان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ہماری سوسائٹی میں کس طرح stereotype بن جاتی ہیں کہ پہلا قتل "عورت" کی وجہ سے ہوا۔ دراصل حقیت یوں ہے کہ پہلا قتل مردانہ بالادستی اور ہوس ناکی کی وجہ سے ہوا۔ لیکن یہ کہاوتیں بن کر ہمارے اجتماعی لاشعور کا کیسے حصہ بنتی ہیں اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شہناز پروین:

> بدن دریدہ ہیں موجود نظم "اقلیما" بھی عورت کو فتنہ اور باعثِ شر سمجھنے کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہاریہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ آج کی عورت کے شعورِ ذات اور اس کی ذات کے ادراک کے ساتھ ساتھ تاریخ میں موجود عورت کے وجود کا بھی صحیح اور مثبت جواز چاہتی ہیں۔ (۲۶)

وہ عورت کے تقدس کو جہاں مذہبی اساطیر کے ساتھ جوڑ کر یا تاریخ کے جبر میں عورت کے استحصال کو موضوع بناتی ہیں وہیں وہ عورت کا سب سے معتبر حوالہ "مامتا" کا بھی سامنے لاتی ہیں۔"۔۔۔۔بچے اور مامتا اس کا مستقل موضوع ہیں۔(۲۷)

فہمیدہ ریاض نے عورت پر لگے بہتان کو صاف کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھی ایک سر رکھتی ہے، وہ کیا چاہتی ہے، وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، کبھی خدا اس سے بھی تو کلام کرے۔ فہمیدہ ریاض نے "اقلیما" کے دھڑ سے ہٹ کر معاشرے کو اس کے "سر" کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

فہمیدہ ریاض کی ایک بہت سادہ اور مختصر سی نظم "زمین دوز ریل میں" عورت کی سوچ کو مہمیز کرنے کی دعوت دیتی ہے اس کی فکر کو اس معاشرتی شکنجے سے آزاد ہونے کی دعوت دیتی ہے جو اس کی سوچ کو جکڑے ہوئے ہے

ے ذہن کو سوچنے دو
اور تخیل کو بھٹکنے دو ذرا
ایسی باتیں، جنہیں سوچو تو نشہ آجائے
ایسے امکان کہ جینے کا مزہ آجائے
ایسی باتیں کہ نہیں جن کی اجازت تم کو
ذہن کو سوچنے دو
یہ تو کچھ جرم نہیں
یہ تو نہیں کوئی گناہ
اور اگر ہے بھی تو پوشیدہ ہے۔(۲۸)

"مقابلہ حسن" جیسی نظم لکھ کر فہمیدہ ریاض نے کنزیومر سوسائٹی میں عورت کو کیسے ماپا تولا جاتا ہے اس پر گہرا طنز کیا ہے۔ یہاں تک عورت کے اعضاء کی پرفیکشن کا معیار متعین کرنے والے مردوں کو اپنی ساخت کا بھی تنقیدی جائزہ لینے کی دعوت دی ہے۔

ایک اور نظم "کب تک" میں عورت کے ساتھ جڑے تولیدی عمل کی بنیاد پر اس کی اہمیت کو اس کے بقیہ وجود سے متعلق سوال اٹھایا ہے۔ڈاکٹر شہناز پروین اپنے ایک مضمون بعنوان "فہمیدہ ریاض: عورت کے حیاتیاتی وجود کا مکمل اظہاریہ" میں لکھتی ہیں کہ

> فہمیدہ کے ہاں جنس کو موضوع بنانا نہ تو ہر گز سستی لذتیت کا حامل ہے اور نہ ہی اس کا مقصد محض چونکانا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا قوی اور توانا جذبہ ہے جو ایک مثبت جواز رکھتا ہے۔ فریقِ ثانی کی ضرورت کا احساس بہت مثبت انداز میں فہمیدہ کے ہا ں موجود ہے۔ یہ نہ تو ماورائی ہے اور نہ ہی منفیت کا حامل بلکہ اس کے بر عکس انسانی فطرت کے قریب ہے۔ (۲۹)

فہمیدہ ریاض اپنی نظم "کب تک" میں عورت کے غیر محفوظ ہونے کا احساس بھی لئے ہوئے ہے۔ جس عورت کی جوانی جب تک اس کے ساتھ ہے، اس وقت شاید اس کے بہت سے قریبی رشتے بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن ڈھلتی عمر میں اس کی جوانی کا رَس چوسنے والے بھنورے کسی نئی منزل کی طرف گامزن ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ سوال اٹھاتی ہیں کہ

کب تک مجھ پیار کرو گے
کب تک؟
جب تک میرے جسم سے بچے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب میرا انگ تنا ہے
میرا اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک (۳۰)

فہمیدہ ریاض نے عورت کے مسائل کو ایک تجربہ کار تخلیق کار کی طرح پیش کیا ہے۔ بقول شہناز پروین:

> فہمیدہ کی شاعری نہ تو صرف ایک عورت کی شاعری اور نہ ہی اس کی مخاطب صرف عورت ہے۔۔۔وہ مرد یا عورت کی تخصیص کے بغیر ایک حساس تخلیق کار ہے جو معاشرے کا ایک جیتا جاگتا اور فعال فرد ہیں۔ (۳۱)

اس طرح کے تلخ تجربات فہمیدہ ریاض کے قلم سے میں مٹی کی مورت ہوں جیسی نظم تخلیق پاتی ہے۔ (۳۲)

فہمیدہ ریاض کی نسائیت کا تجربہ صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ہر عورت کو اس کے وجود کا احساس دلاتے ہوئے اس کی پائمالی کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں:

ے　وہ دھرتی جو سدا تمھاری سیوا کرتی جائے
سر پر ہاتھ دھرو گے تم، بیٹھی ہے آس لگائے
دن ڈوبا ہل پاس کھڑا ہے، دیکھو یہ انیائے
اس کی کوکھ میں بیج تمہارا، دوجا کیوں پھل پائے
یہی ہے ماتا، یہی ہے پتنی، یہی تمہاری بیٹی
پاس وڈیروں کے مت چھوڑو، بڑی اداس رہے گی۔ (۳۳)

فہمیدہ ریاض کے سیاسی شعور کی تربیت میں اس عہد کے سیاسی اور ادبی رجحامات کا بھی اہم کردار ہے۔ فہمیدہ ریاض جب مارکسی فلسفے سے متاثر ہو رہی تھیں اور زمانہ طالب علمی میں ہی سٹوڈنٹ یونینز کی پابندیوں کے خلاف حیدر آباد کی سرگرمیوں میں متحرک تھیں، اس زمانے میں فیض احمد فیض پر آزاد فضاؤں میں سانس لینا ممنوع قرار دیا جانے لگا۔

فہمیدہ کا زمانہ تعلیم پاکستان میں سیاسی افراتفری کا زمانہ تھا جس وقت فہمیدہ بی۔ اے کر رہی تھیں، فیض احمد فیض حکومت سے بغاوت کے الزام میں حیدر آباد جیل میں سزا کاٹ رہے تھے۔ (۳۴)

یہاں سے میں بڑے احترام سے جناب مرتضیٰ علی اطہر سے اختلاف کروں کی کہ جب سے فہمیدہ ریاض بی اے کر رہی تھیں، فیض برسوں پہلے جیل سے باہر آ چکے تھے اور ماسکو سے لینن امن انعام وصول کرنے کے بعد غالباً لندن میں تھے۔

حیدر آباد کی فضا میں طلبا کی سیاست میں شرکت پر پابندی کی وجہ سے بھی فہمیدہ کے باغی ذہن نے سوال اٹھایا ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی اس زمانے میں فیض احمد فیض جیسے ترقی پسند فکر کے ترجمان اور اردو ادب کے اہم شاعر کے کلام کی تپش نے بھی فہمیدہ کی فکری تشکیل میں یقیناً اہم کردار ادا کیا ہو گا۔

اس وقت نیشنل اسٹوڈنٹ فیڈریشن (NSF) نامی تنظیم کافی سرگرم تھی۔
فہمیدہ اس تنظیم کی ایک متحرک کارکن تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ
کمیونسٹ پارٹی کے رابطے میں آئیں۔[۳۵]

انگلینڈ کے قیام کے دوران بھی انہوں نے مارکس کے نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ پاکستان میں واپس آنے کے بعد انہوں نے منافقتوں پر استوار رشتوں سے خود کو علیحدہ کر لیا اور ۱۹۷۲ء میں مکمل طور پر خود کو تخلیقی کاموں کے لئے وقف کر دیا لیکن ان کے اندر کے سماجی اور فلاحی خدمت گار نے بھٹو کے دور میں جمہوریت کے دامن پر لگے دھبوں کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں عصری رویوں اور سیاسی لیڈران کے رویوں میں تضاد بے چین کرنے لگا۔ یہی بے چینی ان کے دوسرے مجموعہ کلام بدن دریدہ (۱۹۷۳ء) میں شاعری کے قالب میں ڈھل کر منظر عام پر آئی۔ اس شعری مجموعے کی نظموں میں عورت کی زبانی ان موضوعات پر لکھا گیا جن پر بات کرنے کا عورت کو اہل سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ جب کہ فہمیدہ نے حالات کا شکوہ کرنے والوں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی دعوت دی اور کہا:

یاں کہ واں
یانہاں
رنگ سنہرا ابھی ہے
اور جو نہیں ہے تو اس کو خلق کر [۳۶]

بھٹو کے دورِ اولیں میں اس نے بھی سوشلزم کے نعرے کا دھوکہ کھا کر اپنے ارد گرد تبدیلی کے خواہاں، وڈیروں سے اور سرمایہ داروں سے ستائے ہوئے لوگ پیپلز پارٹی کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔
شاہ محمد مری اس دور کے حوالے سے فہمیدہ ریاض کے خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فہمیدہ تب بھی بھٹو کے خلاف تھی۔ اس کا یہ خیال ٹھیک نکلا کہ بھٹو سوشلزم کو
محض اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اور پھر اسی زمانے میں نیپ )
NAP)اور پیپلز پارٹی باہم الجھ پڑے اور بلوچستان میں جنگ شروع ہو گئی۔[۳۷]

میں یہاں بڑے ادب سے جناب شاہ محمد مری سے عرض کرنا چاہوں گی کہ نیپ اور پیپلز پارٹی الجھ نہیں پڑے تھے بلکہ بھٹو بلوچستان میں نیپ کی حکومت کو معزول کر کے بلوچستان پر ٹوٹ پڑے تھے۔

فہمیدہ ریاض کا حساس دل بلوچوں کی حمایت میں تڑپ اٹھا اور اس نے کئی نظمیں اس دکھ میں تخلیق کیں۔ فہمیدہ ریاض بدن دریدہ کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> ۔۔۔ جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنادیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں ایک رجز ہیں جنہیں بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے بدن دریدہ ایک رزمیہ ہے۔ (۳۸)

فہمیدہ ریاض نے بلوچستان کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ادیبوں کی ایک تحریک کا آغاز کیا۔ شاہ محمد مری لکھتے ہیں ۔۔۔۔۔ نیپ کی داخلی کمزوریوں اور کھوکھلے پن سے بے خبر الجھی الجھی فہمیدہ بلوچوں کی طرف داری میں سارا ملک پھرتی رہی۔ وہ کوئٹہ آئی، جیل میں گل خان نصیر سے ملی۔ اور پھر اس نے ادیبوں کی ایک ملک گیر دستخطی مہم شروع کر دی۔ وہ اس سلسلے میں پنجاب بھی گئی، مگر اسے پذیرائی نہ ملی۔ (۳۹)

بھٹو کے نظریات سے ہزار اختلاف کے باوجود فہمیدہ ریاض کی انسان دوست طبیعت نے ان کے جلسے پر ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی مذمت کرتے ہوئے "۲۳ مارچ ۱۹۷۳ء کے عنوان سے نظم بھی تخلیق کی۔ "بدن دریدہ" میں ہی وہ سقوطِ ڈھاکہ کے المیے میں ہونے والی پائمالیوں کو موضوع بناتے ہوئے لکھتی ہیں:

اور وہ شہزادیاں
افسروں اور شاہوں کی آغوش میں
ان کے نچلے بدن کیسے پتھرا گئے
وہ عجب مملکت
جانور جس پہ مدت سے تھے حکمران
گورعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا (۴۰)

اسی نظم کے آخری بندوں میں وہ ادیبوں کے کردار پر طنز کرتی ہیں کہ

ان میں جو اہلِ دانش تھے، مدت ہوئی مر چکے تھے جو زندہ تھے بیمار تھے
کچھ عجب اہل فن بھی تو تھے اس جگہ خلعتِ شاہ تھی ان کی واحد دوا

بیشتر قابِ سلطان کے خوشہ چیں
گیت لکھتے رہے، گیت گاتے رہے
عہدِ زریں کے ڈنکے بجاتے رہے

اسی دور میں فہمیدہ نے ظفر علی اجن سید دوسری شادی کی۔ اس کا تفصیلی ذکر باب اوّل میں آچکا ہے۔ لیکن یہاں مقصد فہمیدہ کی سیاسی سرگرمیوں کی وضاحت کرنا ہے۔

فہمیدہ کی انقلاب پسندی نے اسے سندھ کسان انقلابی جماعت کے سربراہ سے شادی کی منزل تک پہنچایا۔ اسی دوران فہمیدہ نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی نوکری سے بھی استعفیٰ دے دیا۔۔ وہ اب وسطی کراچی کے تین کمروں والے ایک معمولی مکان میں رہتی تھی۔ یہ مکان اب گھر نہ رہا بلکہ یہ سندھی کسان انقلابی جماعت کے کارکنوں کا ٹھکانہ بن چکا تھا۔ یہ ان کا گویا ہیڈ کوراٹر تھا۔ میٹنگیں کرنا، پمفلٹ لکھنا اور مستقبل کے پروگرام بنانا۔۔ ایک ہمہ وقتی کام۔[۴۱]

مالی مشکلات، لوگوں کے طعن تشنیع کا نشانہ بننے اور آمریت کی مخالفت کرنے پر چلنے والے مقدموں کی پیروی بھی فہمیدہ ریاض کو اپنے عزم سے نہ ہٹا سکی۔ انہوں نے فوجی آمریت کے خلاف لکھا، مذہب کے نام پر لوگوں کے گمراہ کئے جانے پر ردِ عمل کا اظہار کیا۔ دہشت کے موسموں کا نوحہ لکھا اور بوٹوں کی دھمک کے نیچے کچلے جانے والے عام انسان کے حق میں آواز بلند کی۔

۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ء کے عرصے کے دوران لکھی جانے والی نظموں کو فہمیدہ ریاض نے تیسرے شعری مجموعے "دھوپ" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں سیاسی، سماجی اور نظریاتی مباحث کو نظم کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل نظم کارل مارکس میں وہ اپنی مارکسزم کے ساتھ نظریاتی وابستگی کا اظہار کرتی ہیں وہ سیاست میں مارکسی نظریات کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی خواہاں ہیں۔ وہ نظم میں لکھتی ہیں:

کالی دھرتی پھاڑ کے سورج جہاں جہاں نکلا ہے
آدمیوں نے تڑپ تڑپ کر تیرا نام لیا ہے
اک انسانی نسل نے تجھ کو رہ رہ کر سوچا ہے
ایک نسل نے ہاتھ اٹھا کر تجھے سلام کیا ہے[۴۲]

اپنے تیسرے مجموعے "دھوپ" میں ہوں "ایک کتاب" کے عنوان سے بھی ایک نظم لکھی ہے جس کا موضوع لینن کے افکار ہیں۔ جن کو پڑھ کر شاعرہ کے اندر علم کا اجالا پھیلا ہے۔

یہ کیسا جگ مگ سونا ہے
ان حرفوں میں،
ان لفظوں میں
یہ کچا سونا، جس کی ڈلک سے میرے نین دمک اٹھے
میرے تاریک لہو میں کیسا نڈر اجالا در آیا
اور سارے تن میں پھیل گیا۔ (۴۳)

فہمیدہ ریاض فوجی آمریت کے خلاف بولنے سے کبھی نہ گھبرائیں۔ نہ کبھی وہ بلوچستان کی فوج کشی کے سامنے مصالحت پسند ادیبوں کی طرح منافقت کرتی نظر آئیں۔ اسی طرح وہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ میں پیدا ہونے والے حالات کا بڑی غیر جانبداری سے تجزیہ کرتی ہیں۔ وہ شیخ مجیب کے قتل پر "اکیلا کمرہ" کے عنوان سے نظم لکھتے ہوئے اس کے ارد گرد دہشت کے سایوں کو منڈلاتے دیکھتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

سجدوں میں پڑے یہ غازی
گر دتو اٹھا کر دیکھیں
جس سمت جھکے ہیں ماتھے
اس سمت کہاں ہے کعبہ
اس اُور نہیں کوئی قبلہ
منبر پہ نہیں ہے ملاّ
یہ تو ایک ٹینک کھڑا ہے (۴۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں فہمیدہ ریاض مذہب کے ساہوکاروں اور آمروں کے گٹھ جوڑ کو بے نقاب کرتی ہیں۔

ضیاء الحق کی آمریت، پچھلی تمام آمریتوں سے سخت ثابت ہوئی۔ ۱۹۷۷ء کے اس مارشل لاء میں اسلامائیزیشن کے نام پر "حدود آرڈیننس" اور "قانون شہادت" جیسے قوانین مسلط ہوئے جن کی پاداش میں عورتوں

کے ساتھ مظالم کی شرح کئی گنا بڑھ گئی۔ اس دور کی گھٹن نے فہمیدہ کے ذہن کو خالصتاً سیاسی اور عوامی موضوعات کی طرف موڑ دیا۔

فہمیدہ ریاض کے سیاسی شعور، عصری حقیقت نگاری اور بے باکی ذیل میں "کوتوال بیٹھا ہے"، "خانہ تلاشی"، "سازش" اور "چادر اور چار دیواری" جیسی نظمیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ عدالتی نظم کی حشر سامانیوں کا بھی ذکر کرتی ہیں جو آمروں کے ہاتھوں محض ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھیں۔

کالے کوٹوں میں وکیل
منڈیروں پر کائیں کائیں کر رہے ہیں
بھوکے بچوں کے ہاتھ سے نوالہ جھپٹنے کو تیار (۴۵)

آمریت کے دور میں قانون، طاقتوروں کا آلہ کار بن کر کمزوروں کو دبانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ فہمیدہ ریاض پر چودہ مقدمے چلائے گئے جن میں سے ایک مقدمہ غداری کا بھی تھا۔ لیکن یہ کیسے غدار تھے جو وطن کی مٹی پر امن کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اپنی دھرتی کے لئے گیت لکھ رہے تھے۔ محبت اور مساوی حقوق کے لئے غاصبوں سے دست گریباں تھے۔ "کوتوال بیٹھا ہے" میں شاعرہ لکھتی ہیں کہ کوتوال کو کیا بیان دیں، اور پھر فخر سے سینہ تان کر کہتی ہیں، "اپنا جرم ثابت ہے" لیکن محض ایک ندامت ہے کہ کاش وقت لوٹ آئے کیونکہ ابھی تک حق ادا نہیں ہو پایا۔ جواں سال نذیر عباسی کی شہادت کو موضوع بناتے ہوئے فہمیدہ کہتی ہیں:

جب تلک ہے دَم میں دَم
پھر وہی کریں گے ہم
ہو سکا تو کچھ بڑھ کر
پھر وہ حرف لکھیں گے
تیرہ زاد ہر آمر
کانپ اٹھے جسے پڑھ کر
چیتھڑا ہے یہ قانون!
باغیوں کے قدموں کی
اس سے دھول جھاڑیں گے

آمری نخوست سے
یہ نظام احکامات
بیچ چوک پھاڑیں گے (۴۶)

"کوتوال بیٹھا ہے" میں فہمیدہ ریاض آمریت سے لڑنے کے بعد ماہ و سال کی گردش پر نظر ڈالتی ہیں تو انہیں ویرانہ ہی نظر آتا ہے۔ ایک لڑکا جس نے "کوتوال بیٹھا ہے" دوبارہ سننے کی فرمائش کی ہے۔ اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

اپنے دل کی تلخی سے
خود کلام کیا کرتی
صرف یہ کہا ہنس کر
اتنے نَو دمیدہ ہو
تم کو کیا سناؤں شعر
جب لکھی تھیں یہ سطریں
کوتوال بیٹھا تھا
عمر کٹ گئی اپنی
کوتوال بیٹھا ہے (۴۷)

فہمیدہ ریاض ایک ایسی تخلیق کار ہیں جن کا قلم معاشرتی ناانصافی، بے جا پابندیوں اور گھٹن زدہ معاشرتی رویوں کے ردِ عمل میں پیدا ہونے والے تعفن کو موضوع بناتی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پتھر کی زبان" اگر خود شناسی اور خود آگاہی کی اولین کاوش کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے داخلی کیفیات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا تو مردانہ معاشرے میں عورت کی شاعری میں معیوب سمجھے جانے والے موضوعات پر انہیں حیرت کی نظر سے دیکھا گیا۔ لیکن فہمیدہ ریاض کا قلم ایک باغی ادیب کا قلم تھا جس نے ہر بنائی گئی دیوار سے ٹکرانا اپنا شعار سمجھا اور تا عمر وہ اپنی اسی روش پر بر قرار رہیں اور کبھی باطل سے سمجھوتا نہ کیا۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اگر ایرک فرام کی معرفت کتاب Fear of Freedom کو پاکستانی سیاق و سباق میں ڈھالے گئے ایک ترجمے "ادھورا آدمی" کو ایک بار پڑھ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کی آزادی اور اجتماع کی آزادی کو دو مختلف رویے سمجھتی

ہیں۔ ان کے خیال میں فرد کی سوچ اور اظہار کی آزادی اس کا بنیادی حق ہے لیکن اس گہرے تجزیے کے باوجود پاکستانی سوسائٹی فہمیدہ کے قلم کی تاب لانے سے قاصر تھی، خواہ اس کا رخ خود تخلیق کار کی طرف رہا ہو یا معاشرے کی کج رویوں کی طرف۔ فہمیدہ ریاض سیاسی کارکن بھی رہیں، یہاں تک کہ انہوں نے پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے انتخاب لڑنے کی آرزو بھی کی لیکن اجارہ دار طبقے اس جیسی روشن خیال ادیبہ سے خوف زدہ تھے۔ مبادا کہ ان کی ریاکاریوں کا پردہ ہی چاک نہ کر دے۔ لیکن فہمیدہ نے ضیاء دور میں لگائی جانے والی پابندیوں، انسانی آزادی کے سامنے باندھے گئے بندوں جنہوں نے انسانی ذہن کو ایک خاص سانچے میں ڈھال رکھا تھا، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس جرأت مند ادیبہ نے کسی خوف یا سمجھوتے کے بغیر حالات کا تنہا مقابلہ کیا۔ ان پر ۱۴ مقدمے بنائے گئے جن میں سے ایک کو غداری کا نام دے کر سزائے موت کا سزاوار ٹھہرائے جانے کی بھی ہر ممکن کوشش کی جارہی تھی۔ اسی اثناء میں انہیں بھارت جانے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے وہاں سیاسی پناہ لے لی۔ عامر حسین اس جلاوطنی کے دور کی تلخیوں کو فہمیدہ ریاض کے فن پر مرتب ہونے والے اثرات کی ذیل میں لکھتے ہیں

> ۔۔اس دور میں فہمیدہ ریاض نے جو نظمیں لکھیں وہ ایک جبر کے دور کی طاقت ور اور دلخراش گواہی بن گئیں۔ ان کی نظمیں "خانہ تلاشی"، "کوتوال بیٹھا ہے" اور طویل نظم "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے۔" ایک عورت کے اس دور سے گزرنے اور جھیلنے کی وہ داستان سناتے ہیں جو کسی رزمیہ کی مانند ہیں۔ (۴۸)

فہمیدہ ریاض کی نظم "۲۳ارچ ۱۹۷۳ء راولپنڈی میں حزب اختلاف کے جلسے پر چار گھنٹے ہونے والی فائرنگ کے واقعے کو موضوع بناتی ہے۔ نظم کے ابتدائی حصے میں خوف اور دہشت کو موضوع بنایا گیا جو دفعتاً کسی بھی ممکنہ حادثے سے پہلے فضا کو سوگوار بنا دیتا ہے۔ گلی کوچے اداس اور ویران جب کہ مقامی باشندوں کے دل اور دماغ ادہام کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ خوف کا یہ سایہ راہگیروں اور کوچہ و بازار میں بند دروازوں پر دستک دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن خوف جب حد سے بڑھ جائے تو انسان کے اعصاب ایک خاص قسم کے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں جس کو مزاحمتی رویہ کہا جانا ہی مناسب ہو گا۔ فہمیدہ ریاض پر اس پر اسراریت اور خوف و ہراس والی فضاء کا اثر کچھ اس انداز میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

غم واندوہ سے پامال و شکستہ تن ہو
آؤ اے ہم وطنو! رقص کرو، رقص کرو

غیظ کا رقص، بکھرتے ہوئے پندار کا رقص
رنج و رسوائی کا امیدِ نگوں سار کا رقص
پیرہن چاک کرو مصلحت اندیشی کا
اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھاڑ میں آؤ
جسم کو رقص کے گرداب میں چکرانے دو
جسم و جاں رقص کریں، نطق و زباں رقص کریں
تلملاتا ہے لہو آج مری رگ رگ میں (۴۹)

اس عنوان کو ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کے منظر نامے میں فہمیدہ ریاض معاشرے کے رویوں پر نوحہ کناں ہیں۔ جہاں انسان حرکت و عمل سے تماشہ بنے ہوئے ہیں، اور ہر چہرے پر ریاکاری کا نقاب ہے۔

علماء دشمنِ فہم و تحقیق
کودنی شیوہء دانش منداں
سبز خط، عاقبت و دیں کے اسیر
پارسا خوش تن و نوخیز جواں
شاعرِ قوم پہ بن آئی ہے
کذب کیسے ہو تصوف میں نہاں
لب ہیں مصروفِ قصیدہ گوئی
اور آنکھوں میں ہے ذلتِ عریاں (۵۰)

فہمیدہ ریاض جنگ و جدل کے خلاف قلم اٹھاتی ہیں، جہاں بھی کسی آواز کو گولی سے دبوچنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہاں فہمیدہ ریاض اور اس طرح کی سوچ رکھنے والے ادیب مظلوم کا نوحہ لکھتے ہیں اور ظالم کو اس کے مذموم ارادوں سمیت بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔ خواہ انہیں اس سچ کی پاداش میں قید و بند یا غداری کا الزام ہی کیوں نہ سہنا پڑے۔

فہمیدہ ریاض کی نظم "پتھر کی زبان۔ ۲" میں بلوچستان پر ہونے والی فوج کشی کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ جس میں نوجوانوں کے بدن پارہ پارہ اور ان کا لہو کہستان میں رواں ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض حاکم وقت کو اس حقیقت کا ادراک کروانا چاہتی ہیں کہ:

خون بیدار ہے جلدِ رستا نہیں
سینہ ءسنگ میں جذب ہوتا نہیں
صبحِ محشر، کہ جب
قہرمانی کا اک پیکرِ آتشیں بن کے سورج زمیں سے نکل آئے گا
جو بھی ہے اس زمیں پر وہ جل جائے گا
جو لہو تھم گیا
سنگ پر جم گیا
اس لہو کی سیاہی رہے گی
یہ سیاہی رہے گی ابد تک
بے حسوں کی جبینوں کی کالک
اس سیاہی کو پھر کون دھو پائے گا
وقت لکھتا ہے تاریخ کا فیصلہ (۵۱)

اس طرح ایک اور نظم بعنوان "پہلا باب" میں بھی تخلیق کار کے ارد گرد پھیلی نا آسودگیاں اس کی فکر اور فن پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں، کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شاعرہ کو لگنے لگتا ہے کہ اس کے تخلیقی سوتے خشک ہونے لگے ہیں۔ اور وہ معاشرے سے الجھتے ہوئے کہتی ہیں کہ

میری روح سیدھی ہے، تم اسے ٹیڑھے سانچے میں کیسے سمو سکتے ہو!!
میں اسے موڑ توڑ نہیں سکتی۔ (۵۲)

وہ اپنی زندگی پر چھائے خوف کے آسیب سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنا ہتھیار، یعنی قلم لے کر میدان میں اترتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ایک رزمیہ لکھیں، جس میں اس عہد کی منافقت کا پردہ چاک ہو، جس میں جنگجوؤں

کے خون آشام ارادوں کی بات ہو، اور کرسی سے چپکے ریاکار افسروں کی بات ہو، لیکن بارود کا گیت لکھنے کا عہد کرتے ہوئے شاعرہ کا حساس دل کہیں ڈوبنے بھی لگتا ہے۔ اپنے ہمزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے ؟
ڈرو مت، پورا سچ بدصورت نہیں ہوتا
وہ تو چاند کے داغ کی مانند ہے
کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے ؟
کہا تم نے کبھی خوف کی شکل دیکھی ہے ؟
شاید کسی نے بھی نہیں دیکھی
اس کا چہرہ سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوتا ہے
اور ہاتھوں میں انجانے حکم نامے ہوتے ہیں
جن کی تعمیل۔۔۔۔
بھیانک خواب کی مانند (۵۳)

فہمیدہ ریاض اس دہشت کے موسم میں رہنے والوں کی نفسیات پر مرتب ہونے والے اثرات کا بھی جائزہ لیتی ہیں۔ ہر وقت کے چھاپے اور قانون کے نام دہشت اور بربریت کی وجہ سے ذہن "پرونایا" کا شکار ہوتے ہیں اور بقول شاعرہ:

اس مرض کا علاج یہ گولیاں نہیں
کیا تم نے ایک میز پر بیٹھ کر
سرکاری مخبر کے ساتھ چائے پی ہے (۵۴)

اس نظم میں وہ مارشل لاؤں کے دور میں پھیلی خوف اور ہر وقت پیچھا کرتے مخبروں، پولیس گردی اور بُوٹوں کی دھمک کو محسوس کرتے ہوئے اپنے عہد کا رزمیہ لکھتی ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری ایک باشعور اور حساس ادیب کے قلم سے نکلے وہ گیت ہیں جو ابتداء میں محبت کے نغمے بکھیرتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں معاشرتی عدم توازن اور صنفی امتیازات کو دیکھ کر کرب میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی گہری نظر جب بغور معاشرے کے ابتذالی رویوں پر پڑتی ہے تو ان کی شاعری کے موضوعات ایک نوحے

کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔یوں ان کا موضوعاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کے فکری اور فنی ارتقاء کو بھی با آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری ایک فرد کا ایسا سفر ہے جو ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہا ہے جس پر کئی بے جوڑ قدغنیں عائد کر دی گئی ہیں۔جو سوچنے سے لے کر بولنے تک،اور بولنے سے لے کر خیالات کو کاغذ پر ترتیب دینے تک کئی سیاسی اور سماجی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ خالدہ حسین "نسائی خود شناسی اور فہمیدہ ریاض دیباچہ "دھوپ" مشمولہ سب لعل و گہر،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز)،ص۷۶۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ شاہ محمد مری، فہمیدہ ریاض،بسلسلہ عشاق کے قافلے،(کوئٹہ:۲۹،سنگت،دوسری اشاعت ۲۰۱۸ء)،ص۱۸۔

۴۔ عامر حسین،"فہمیدہ ریاض کا فن"،دیباچہ سب لعل و گہر،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)۔

۵۔ فہمیدہ ریاض،دیباچہ "پتھر کی زبان" مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں،ص۹۔۱۰۔

۶۔ فہمیدہ ریاض،دیباچہ،"پتھر کی زبان" مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں،ص۔۱۱

۷۔ خالدہ حسین۔۱۹۹۱ءص۷۶۔

۸۔ شاہ محمد مری،فہمیدہ ریاض،بسلسلہ عشاق کے قافلے،(کوئٹہ:۲۹سنگت،دوسری اشاعت ۲۰۱۸ء)،ص۲۱۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ فہمیدہ ریاض،پتھر کی زبان" مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں،ص۲۶۔

۱۱۔ شاہ محمد مری،ص۲۴۔

۱۲۔ خالدہ حسین۔۔۔ص۷۷۔

۱۳۔ ایضاً،'پتھر کی زبان" مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں،ص۵۵۔

۱۴۔ ایضاً،ص۷۱۔

۱۵۔ ایضاً،ص۸۲۔

۱۶۔ ایضاً ص۸۵۔

۱۷۔ ایضاً، بدن دریدہ، (کراچی: مکتبہ دانیال، ایڈیشن دوم، ۱۹۷۴ء)، ص۱۵۔

۱۸۔ ایضاً، ص۱۸۔

۱۹۔ شاہ محمد مری، ص۲۶۔۲۷۔

۲۰۔ ایضاً، ص۲۱۔

۲۱۔ فہمیدہ ریاض، "ابر بہار" مشمولہ بدن دریدہ، ص، ۳۰۔

۲۲۔ شاہ محمد مری، ص۲۷۔

۲۳۔ فہمیدہ ریاض، "میگھ دُوت"، مشمولہ بدن دریدہ۔ ص۳۶۔

۲۴۔ شاہ محمد مری، ص۲۰۔

۲۵۔ فہمیدہ ریاض "اس قدر تر و تازہ، مشمولہ بدن دریدہ۔ ص۵۳۔

۲۶۔ شہناز پروین، "فہمیدہ ریاض: عورت کے حیاتیاتی وجود کا مکمل اظہاریہ" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ۲۸، دسمبر ۲۰۱۵ء، ص۱۹۱۔

۲۷۔ خالدہ حسین۔ "نسائی خود شناسی اور فہمیدہ ریاض دیباچہ "دھوپ" مشمولہ سب لعل و گہر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص۸۲۔

۲۸۔ ایضاً، "زمین دوز ریل میں" مشمولہ بدن دریدہ، ص۶۱۔

۲۹۔ شہناز پروین، "فہمیدہ ریاض: عورت کے حیاتیاتی وجود کا مکمل اظہاریہ" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ۲۸ دسمبر ۲۰۱۵ء، ص۱۸۸۔

۳۰۔ فہمیدہ ریاض "کب تک" مشمولہ بدن دریدہ، میں مٹی کی مورت ہوں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،)، ص۱۳۷۔

۳۱۔ شہناز پروین، "فہمیدہ ریاض: عورت کے حیاتیاتی وجود کا مکمل اظہاریہ" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ۲۸ دسمبر ۲۰۱۵ء، ص۱۹۱۔

۳۲۔ فہمیدہ ریاض "میں مٹی کی مورت ہوں" مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص۱۷۷۔

۳۳۔ ایضاً، "سہج چلی پروائی"، مشمولہ میں مٹی کی مورت ہوں، ص۲۰۰۔

۳۴۔ مرتضیٰ علی اطہر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت (دہلی: کتابی دنیا،۲۰۰۹ء) ص ۳۷۔
۳۵۔ مرتضیٰ علی اطہر، ایضاً!۔ ص ۳۷۔
۳۶۔ مردمکِ چشمِ من۔
۳۷۔ شاہ محمد مری، ص ۳۰۔۳۱۔
۳۸۔ فہمیدہ ریاض، بدن دریدہ، میں مٹی کی مورت ہوں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء) ص ۹۳۔
۳۹۔ شاہ محمد مری۔ ص ۱۳۔
۴۰۔ فہمیدہ ریاض، شہر والو سنو، ص ۱۸۰۔
۴۱۔ شاہ محمد مری۔۔ ص ۳۲۔
۴۲۔ فہمیدہ ریاض، کارل مارکس، ص ۲۵۴۔
۴۳۔ ایضاً، "ایک کتاب"، سب لعل و گہر، ص ۱۸۳۔
۴۴۔ ایضاً، "اکیلا کمرہ"۔
۴۵۔ ایضاً۔
۴۶۔ ایضاً، "کوتوال بیٹھا ہے"، سب لعل و گہر، ص ۳۴۳۔
۴۷۔ ایضاً، "سب لعل و گہر۔ ص ۴۵۹۔
۴۸۔ عامر حسین، فہمیدہ ریاض کا فن، مشمولہ سب لعل و گہر، ص ۱۷۔
۴۹۔ 'فہمیدہ ریاض، '۳۲ مارچ ۱۹۷۳ء' مشمولہ سب لعل و گہر، ص ۱۸۔
۵۰۔ ایضاً، ۳۲ مارچ ۱۹۷۴ء۔
۵۱۔ ایضاً، "پتھر کی زبان۔ ۲"
۵۲۔ ایضاً، "پہلا باب" ۔
۵۳۔ ایضاً، "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟ "
۵۴۔ ایضاً۔